اسوۂ ابراہیمی ــ قرآن کی روشنی میں

محمد رضی الاسلام ندوی

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا شمار ان انبیاء کرام میں ہوتا ہے جن کا تذکرہ قرآن میں کثرت سے آیا ہے۔ آپ کا ظہور ایک ایسی قوم میں ہوا جو شرک اور مظاہر پرستی میں غرق تھی۔ اس نے سیکڑوں دیوی دیوتا بنا رکھے تھے۔ آپ نے منصب نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد اسے توحید کی دعوت دی۔ شرک اور اس کے مظاہر پر زبردست تنقید کی اور غیر اللہ کی بے بسی اور بے بضاعتی کا عملی مظاہرہ بھی کر دکھایا۔ لیکن آپ کی قوم ایمان نہ لائی۔ بالآخر اس پر اتمام حجّت کر دینے کے بعد آپ نے اپنے وطن سے ہجرت کی اور دوسرے علاقوں میں اللہ کی دعوت عام کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ بڑھاپے میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اولاد سے نوازا تو اسے لے جا کر ایک "بے آب وگیاہ وادی" میں بسا دیا تاکہ وہ جگہ مستقبل میں توحید کا مرکز بن جائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی نسل میں برکت دی اور آپ کی دعوت بھی خوب پھلی پھولی۔ اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ آج دنیا کے تین بڑے مذاہب یہودیت، مسیحیت اور اسلام کے ماننے والے آپ ہی سے شرفِ انتساب رکھتے ہیں۔

قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کو بہت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اور آپ کی ملت کی پیروی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا پہلو بھی ہے جو کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ وہ یہ کہ قرآن نے آپ کے ذاتی اوصاف بھی نمایاں کئے ہیں اور آپ کی نجی زندگی کو بھی اسوہ بنا کر پیش کیا ہے۔ سورۂ ممتحنہ (آیت ۴-۶) میں ہے:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ   تم لوگوں کے لئے ابراہیم میں ایک اچھا

فِيٓ اِبْرٰهِيْمَ الآیہ نمونہ ہے۔

اس مقالہ میں اسی پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اور قرآن کی روشنی میں حضرت ابراہیمؑ کے ذاتی اوصاف سے بحث کی گئی ہے۔

ا۔ شرک سے بے زاری (حنیفیت)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کا سب سے نمایاں اور امتیازی وصف ان کا شرک و بت پرستی سے براءت، بے زاری اور نفرت اور خدائے واحد پر ایمان ہے۔ ان کی پیدائش اور پرورش ایک ایسی قوم میں ہوئی جس میں بت پرستی اور ستارہ پرستی عام تھی۔ سیکڑوں دیوی دیوتاؤں کو خدائی میں شریک کر لیا گیا تھا اوران کے سامنے جبینِ نیاز خم کی جاتی تھی۔ ان کا باپ نہ صرف بت پرست بلکہ بت ساز بھی تھا۔ اور اسے سوسائٹی میں اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شعور کی آنکھیں کھولیں تو انھیں اس ماحول میں سخت گھٹن محسوس ہوئی۔ ان کی فطرت نے انھیں توحید تک رہنمائی کی۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے انھیں منصبِ نبوت سے سرفراز کیا تو انھوں نے اپنے باپ اور قوم کو راہِ ہدایت کی طرف بلانے کے ساتھ ساتھ شرک سے اپنی بے زاری اور براءت کا بھی اعلان کر دیا:۔

يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (الانعام: ۷۸-۷۹)	اے برادرانِ قوم: میں ان سب سے بے زار ہوں جنھیں تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔ میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

ان کی قوم بحث و مجادلہ کے درپے ہوئی تو اس کی بھی انھوں نے مطلق پرواہ نہ کی اور اس سے، دوٹوک انداز میں کہہ دیا:

اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ	کیا تم لوگ اللہ کے معاملہ میں مجھ سے

وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ	جھگڑتے ہو؟ حالانکہ اس نے مجھے راہ
(الانعام: ۸۰)	راست دکھادی ہے اور میں تمہارے
	ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے نہیں ڈرتا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ حال نبوت کے بعد ہی کا نہ تھا بلکہ وہ اپنی ابتدائی زندگی ہی سے فطرتِ سلیم پر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں رشد و ہدایت کے جادۂ مستقیم پر قائم رکھا تھا۔ ارشاد ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ	اس سے پہلے ہم نے ابراہیم کو اس کی
مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ	ہوشمندی بخشی تھی اور ہم اس کو خوب
(الانبیا: ۵۱)	جانتے تھے۔

اس آیت میں 'رشد' سے اگرچہ بعض مفسرین نے نبوت مراد لی ہے لیکن اکثر مفسرین کے نزدیک اس کا مطلب ہدایت، معرفتِ الٰہی، ہوشمندی اور راست روی ہے۔ 'مِنْ قَبْلُ' کی بھی دو توجیہیں کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد ہے 'حضرت موسیٰؑ سے پہلے' جن کا تذکرہ ماقبل آیات میں موجود ہے۔ دوسری یہ کہ اس سے ابتدائی عمر کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو بچپن ہی سے رشد و ہدایت سے نوازا تھا۔ پہلی توجیہ حضرت ابن عباسؓ سے اور دوسری ان کے شاگرد حضرت مجاہدؒ سے منقول ہے[۲]۔ مفسرین میں سے ابن جریر طبریؒ نے پہلی اور ابن کثیرؒ نے دوسری توجیہ کو اختیار کیا ہے[۳]۔ بعد کے مفسرین نے ان دونوں توجیہوں کو نقل کر دیا ہے یا ان میں سے کسی ایک کو اختیار کیا ہے[۴]۔ اس کی بعض اور توجیہیں بھی کی گئی ہیں[۵]۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس امتیازی وصف کو نمایاں کرنے کے لئے قرآن نے متعدد تعبیریں اختیار کی ہیں۔ سورہ صافات میں ہے:

وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ	اور اس کے (یعنی حضرت نوحؑ کے) طریقے
اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ	پر چلنے والا ابراہیم تھا جب وہ اپنے
(الصافات: ۸۳-۸۴)	رب کے حضور قلب سلیم لے کر آیا۔

مذکورہ آیت میں حضرت ابراہیمؑ کو 'پاکیزہ دل' کہا گیا ہے۔ بعض مفسرین نے اس کا عام مفہوم

مراد لیا ہے۔ یعنی الیسا دل جو تمام اعتقادی و اخلاقی خرابیوں سے پاک ہو۔ اس کی دلیل انھوں نے یہ دی ہے کہ یہاں یہ لفظ مطلق آیا ہے اس لئے اسے کسی ایک معنی کے لئے خاص کرنا مناسب نہیں [۲] جب کہ بعض دیگر مفسرین کے نزدیک اس سے مراد ہے شرک کی آلودگی سے پاک دل۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ مابعد آیات میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے شرک میں مبتلا ہونے پر ان کی مذمت کی ہے [۷] ابن عباسؓ، مجاہدؒ، قتادہؒ، حسنؒ، سدیؒ وغیرہ سے بھی یہی تاویل مروی ہے [۸]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حق پرستی اور شرک سے بے زاری کو نمایاں کرنے کے لئے قرآن نے ایک لفظ 'حنیف' کا استعمال کیا ہے۔ یہود اور نصاریٰ میں سے ہر ایک، باوجود اپنی تمام گمراہیوں اور صریح شرک کے، دعویٰ کرتا تھا کہ صرف وہی حضرت ابراہیمؑ کے بتائے ہوئے طریقے پر ہے۔ اس کے جواب میں ان سے کہا گیا:

مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا	ابراہیم نہ یہودی تھا نہ عیسائی بلکہ وہ
نَصْرَانِيًّا وَلَٰكِن كَانَ حَنِيفًا	تو ایک مسلم یکسو تھا اور وہ ہرگز مشرکوں
مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝	میں سے نہ تھا۔

(آل عمران: ۶۷)

لفظ 'حنیف' کا مادہ 'حنف' ہے۔ لغت میں اس کے اصل معنی کیا ہیں؟ اس سلسلہ میں ماہرین لغت سے دو اقوال منقول ہیں: ایک یہ کہ اس کے معنی مائل ہونے اور جھکنے کے ہیں۔ عربی زبان میں احنف اس شخص کو کہتے ہیں جس کے دونوں پیر مڑے ہوئے ہوں۔ اس اعتبار سے حنیف کے معنی ہوں گے وہ شخص جو ہر طرف سے کٹ کر صرف اللہ کے دین کی طرف مائل ہو۔ دوسرا قول یہ ہے کہ حنف کے معنی سیدھا ہونے کے ہیں۔ عربی زبان میں لنگڑے کے لئے احنف کا لفظ اچھے شگون کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے متعدد الفاظ ہیں جنھیں برعکس مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً جس شخص کو کوئی موذی کیڑا، سانپ بچھو وغیرہ کاٹ لے اسے 'سلیم' (لفظی معنی نجات پانے والا) اور کھائی کو مفازۃ (لفظی معنی جائے نجات) کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے حنیف اس شخص کو کہا جائے گا جو ٹھیک ٹھیک اللہ کے دین پر قائم ہو اس سے سرِمو بھی انحراف نہ کرے [۹]

بہر حال ان میں سے جو معنی بھی اختیار کئے جائیں، قرآن کی اصطلاح میں حنیف سے مراد

وہ شخص ہے جو شرک سے بالقصد اعراض کر کے اور اسے علیٰ وجہ البصیرہ ترک کر کے حق کی طرف رجوع ہو۔ اس طور پر کہ اسے کوئی چیز حق قبول کرنے سے باز نہ رکھ سکے۔ یہ لفظ قرآن میں دس مقامات پر آیا ہے ان میں سے آٹھ مقامات پر اس کا استعمال حضرت ابراہیم کے لئے ہوا ہے اور ایک جگہ کے علاوہ سب جگہوں پر اس کے بعد 'وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ' یا اس جیسے الفاظ بھی آئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا استعمال شرک کے بالمقابل ہوا ہے۔

۲۔ کامل اطاعت الٰہی

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پوری زندگی نگاہوں کے سامنے ہو تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے پورے طور پر خود کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع کر دیا تھا۔ اور اس کے ارشادات واحکام پر عمل پیرا ہونے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ جب تک اللہ تعالیٰ نے انھیں وطن میں رہ کر دعوت کا مشن جاری رکھنے کا حکم دیا، وہ سخت سے سخت حالات کی پرواہ کئے بغیر اس فریضہ کو سر انجام دیتے رہے۔ ان کی قوم نے آبائی دین کی توہین کے جرم میں آگ میں ڈال دیا تو اس موقع پر بھی انھوں نے بے مثال استقامت کا مظاہرہ کیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے گھر بار، خاندان اور وطن کو چھوڑ کر ہجرت کرنے کا حکم دیا تو اس حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ بڑھاپے کی عمر کو پہنچنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک اولاد سے نوازا جو مستقبل کا سہارا اور امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز تھا۔ مگر جب اسے اپنی ماں کے ساتھ بے آب وگیاہ وادی میں لا بسانے کا حکم دیا تو اس پر عمل کرنے میں بھی ذرا پس وپیش کا مظاہرہ نہیں کیا۔ پھر جب اس دشتِ غربت میں اس اکلوتے اور محبوب فرزند کی گردن پر چھری پھیر دینے کا اشارہ ملا تو اس پر عمل کرنے کے لئے بھی اپنی آستینیں چڑھا لیں۔ گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت، خود سپردگی اور نفس کو مرضیٔ مولا کے تابع کر دینے کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

قرآن نے اسی چیز کو لفظ "اسلام" سے تعبیر کیا ہے:

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (البقرہ: ۱۳۱)	اس کا حال یہ تھا کہ جب اس کے رب نے اس سے کہا "مسلم ہو جا" تو اس نے فوراً کہا "میں مالک کائنات کا مسلم ہو گیا۔"

اسلام کے لفظی معنی اطاعت و فرماں برداری، خضوع، خود سپردگی اور اخلاص کے ہیں۔ مسلمان کو مسلم، اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی اطاعت کے لئے ہمہ تن آمادہ رہتا ہے [۱] زید بن عمرو بن نفیل، جن کا شمار عہد جاہلیت کے حنفاء میں ہوتا ہے، ان کے دو اشعار یہ ہیں:

وَاَسْلَمْتُ وَجْهِیْ لِمَنْ اَسْلَمَتْ ۔ لَهُ الْاَرْضُ تَحْمِلُ صَخْرًا ثِقَالًا

وَاَسْلَمْتُ وَجْهِیْ لِمَنْ اَسْلَمَتْ ۔ لَهُ الْمُزْنُ تَحْمِلُ عَذْبًا زُلَالًا [۲]

(ترجمہ: میں نے اس ذات باری کے آگے اپنا سر تسلیم خم کر دیا ہے جس کے حکم پر زمین بھاری چٹانوں کو اٹھائے ہوئے ہے اور بادل میٹھا پانی لے کر اِدھر اُدھر جاتے ہیں۔)

مذکورہ بالا آیت میں حضرت ابراہیمؑ کی زبانِ مبارک سے اظہارِ اطاعت کا بیان ہے۔ مگر آیت کو اسی محدود معنی تک رکھنا صحیح نہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے نہ صرف زبان قال سے فرمانبرداری کا اظہار کیا بلکہ زندگی کے ہر ہر لمحے میں زبان حال سے اس کا ثبوت بھی فراہم کیا۔ راغب اصفہانی نے لکھا:

"اسلام، کے لئے محض زبانی اعتراف کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ضروری ہے کہ دل میں وہی بات ہو جس کا زبان سے اظہار کیا جا رہا ہے، عمل سے بھی اس کی تصدیق ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جو فیصلے کر دیئے ہیں اور جو چیزیں مقدر کر دی ہیں ان کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے، جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کے سلسلہ میں مذکور ہے" [۳]

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی اطاعتِ الٰہی کا نقطۂ عروج ہمیں واقعۂ ذبح میں نظر آتا ہے۔ خواب میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے بیٹے کو ذبح کرنے کا اشارہ پاکر وہ فوراً اس پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ بیٹے سے اس خواب کا ذکر کیا تو اس نے بھی احکام الٰہی کے سامنے اپنی جبینِ نیاز خم کر دی۔ دونوں کی اس کیفیت کو قرآن نے لفظ 'اسلام' سے تعبیر کیا ہے:

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ ۝ وَ	آخر کو جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا
نَادَیْنٰهُ اَنْ یّٰٓاِبْرٰهِیْمُ ۝ قَدْ	اور ابراہیمؑ نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا
صَدَّقْتَ الرُّءْیَا اِنَّا كَذٰلِكَ	اور ہم نے ندا دی کہ اے ابراہیم تو نے
نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝	خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں

(الصافات: ۱۰۳-۱۰۵) کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔

بائیبل میں بھی حضرت ابراہیمؑ کی اللہ کی اطاعت اور رضا طلبی کا بارہا تذکرہ آیا ہے:

"خداوند نے ابرہام سے کہا کہ تو اپنے وطن اور اپنے ناتے داروں کے بیچ سے اور اپنے باپ کے گھر سے نکل کر اس ملک میں جا، جو میں تجھے دکھاؤں گا۔۔۔۔۔۔

سو ابرام خدا کے کہنے کے مطابق چل پڑا"[۱۴]

"خداوند فرماتا ہے چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے دریغ نہ رکھا اس لئے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی ہے کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا ۔۔۔۔۔۔۔۔ کیونکہ تو نے میری بات مانی"[۱۵]

(یسوع ۔۔۔ حضرت عیسیٰؑ ۔۔۔ نے کاہنوں سے کہا) "میں تمہارے خلاف پکار کر کہتا ہوں کہ تم شیطان کی اولاد ہو نہ کہ ابرہام کی جس نے خدا کی محبت میں اپنے باپ کا گھر چھوڑ دیا اور اپنے بیٹے کو ذبح کرنے پر تیار ہو گیا"[۱۶]

"خدا کے کہنے کے مطابق" "تو نے میری بات مانی" "خدا کی محبت میں" جیسے الفاظ سے حضرت ابراہیمؑ کی کامل اطاعتِ الٰہی اور مرضیٔ رب کے آگے خود سپردگی کا اظہار ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے جذبۂ اطاعت اور مکمل فرمانبرداری پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھی مہر تصدیق ثبت کر دی گئی ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى (النجم: ۳۷) اور ابراہیم جس نے وفا کا حق ادا کر دیا۔

دوسری جگہ ہے:

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا وَّلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (النحل: ۱۲۰) واقعہ یہ ہے کہ ابراہیم اپنی ذات سے ایک پوری امت تھا۔ اللہ کا مطیع فرمان اور یک سو۔ وہ کبھی مشرک نہ تھا۔

قنوت کے معنی اطاعت گزاری اور تابع داری کے ہیں۔ حضرات صحابہؓ میں سے ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ اور حضرات تابعین میں سے مجاہدؒ اور قتادہؒ نے قانت کی تشریح 'مطیع' سے کی ہے[۱۷] راغب اصفہانی نے لکھا ہے: "خضوع کے ساتھ اطاعت کرنے کو قنوت کہتے ہیں"[۱۸]

اس آیت میں لفظ 'اُمّۃ' کے کیا معنی ہیں؟ اس سلسلہ میں اہل تفسیر سے مختلف اقوال مروی ہیں:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ امت سے مراد وہ شخص ہے جو لوگوں کو اچھائی کی تعلیم دیتا ہے۔

حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں: لفظ 'اُمّۃ' اپنے معروف معنی میں ہے۔ اپنے عہد میں حضرت ابراہیم تنہا مومن تھے۔ بقیہ تمام لوگ کافر تھے اس بنا پر انھیں تن تنہا ایک امت قرار دیا گیا۔

حضرت قتادہؓ کے نزدیک اس کے معنی امام کے ہیں[۵۹]

متاخرین میں مولانا فراہیؒ نے امۃ کو 'اطاعت گذار' کے معنی میں لیا ہے اور اس معنی کی تعیین میں بعض جاہلی اشعار سے استشہاد کیا ہے۔[۶۰]

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی وفاداری، بے کم و کاست اطاعت اور خود سپردگی کا صلہ یہ دیا کہ انھیں رہتی دنیا تک کے لئے امام بنا دیا۔ قرآن کہتا ہے:

وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ	یاد کرو کہ جب ابراہیم کو اس کے رب
فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ	نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ ان سب
لِلنَّاسِ اِمَامًا	میں پورا اتر گیا تو اس نے کہا: "میں
(البقرۃ: ۱۲۴)	تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔"

اس آیت میں "کلمات" سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلہ میں متعدد اقوال مروی ہیں۔ علامہ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ "کلمات سے مراد شرائع، اوامر اور نواہی ہیں۔ اور ان کو پورا کر دکھانے کا مطلب یہ ہے کہ انھیں جس چیز کی بھی ہدایت کی گئی، جس کام کا بھی حکم دیا گیا اور جس بات سے بھی روکا گیا انھوں نے ٹھیک ٹھیک اس کے مطابق عمل کیا اور اچھے طریقے سے سرانجام دیا۔ ان کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی کی نہ کسی سستی کا مظاہرہ کیا۔ اسی معنی میں سورۃ النجم کی آیت ۳۷ "وَاِبْرٰهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰۤی" ہے۔ یعنی انھیں جو حکم بھی دیا گیا، اس کی انھوں نے ٹھیک ٹھیک بجا آوری کی۔ عبادت کے کسی موقع پر کوئی چیز ان کی راہ میں حارج نہ ہو پاتی تھی۔"[۶۱]

منصبِ امامت سے سرفراز کئے جانے کے بعد بھی ان کی اطاعت و فرماں برداری میں ادنیٰ

سافرق نہیں آیا۔ بلکہ وہ ہمہ وقت اپنے تمام کاموں، آرزوؤں، دعاؤں اور حرکات وسکنات میں مرضیٔ رب کو پیش نظر رکھتے تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ جب امامت کی بشارت پاکر انھوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ یہ شرف آئندہ ان کی نسل کو بھی حاصل رہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں واضح کردیا کہ جو لوگ کفر وشرک میں مبتلا ہوکر ظلم کا ارتکاب کریں گے اس عہد کا ان سے کوئی تعلق نہ ہوگا (البقرہ: ۱۲۵) تو اس فیصلۂ الٰہی کو حضرت ابراہیمؑ نے اپنے ذہن میں اس حد تک مستحضر رکھا کہ جب انھوں نے مکہ کے باشندوں کے لئے غذائی ضروریات کی فراوانی کی دعا کی تو پہلے ہی صراحت کردی کہ میری یہ دعا صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو اللہ اور روز آخر پر ایمان لائیں (البقرہ: ۱۲۶) اس سے حضرت ابراہیمؑ کے بلند مرتبۂ تسلیم ورضا کا اندازہ ہوتا ہے کہ اگر انھیں اشارہ بھی مل گیا کہ فلاں سمت میں رب کی رضا ہے تو فوراً ادھر چل پڑے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے وضاحت کردی کہ امامت پر معیشتِ دنیا کے معاملات کو قیاس کرنا صحیح نہیں۔ ایمان کی تخصیص صرف امامت کے معاملے میں ہے۔ جہاں تک روزی کا سوال ہے اس سے اللہ تعالیٰ اہل ایمان اور کافروں دونوں کو نوازتا ہے (البقرہ: ۱۲۶)۔[۲۲]

۳۔ استغفار وانابت:

اللہ تعالیٰ سے اس درجہ قربت رکھنے اور اس کے ایک ایک اشارہ کی فوراً تعمیل کرنے کے باوجود حضرت ابراہیمؑ کو ہمہ وقت احساس رہتا تھا کہ کہیں ان سے فرائض کی انجام دہی میں کوئی کوتاہی نہ ہوگئی ہو۔ یہ احساس انھیں توبہ واستغفار اور رجوع وانابت پر آمادہ کرتا تھا۔ یہ ایک اعلیٰ ترین صفت ہے جو کسی مومن بندے میں پیدا ہوسکتی ہے۔ قرآن میں حضرت ابراہیم کا ایک یہ وصف بھی بیان کیا گیا ہے:

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُّنِيبٌ (ھود: ۷۵)	حقیقت میں ابراہیم بڑا حلیم اور نرم دل آدمی تھا اور ہر حال میں ہماری طرف رجوع کرتا تھا۔

لفظ 'منیب'، نوب سے مشتق ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کا بار بار پلٹنا۔ شہد کی مکھی

کے لئے عربی زبان میں ایک لفظ 'انوب' بھی آتا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ بار بار اپنے چھتے کی طرف پلٹ کر آتی ہے۔ اللہ کی طرف انابت کا مطلب ہے توبہ واستغفار کے ذریعے اس کی طرف رجوع ہونا اور اخلاص کے ساتھ اس کے حکموں کو بجالانا۔[۲۳]

حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی اور اللہ تعالیٰ کے احسانات گنائے تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ مجھے اس سے اپنی مغفرت کی توقع ہے:

وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ (الشعراء: ۸۲)	اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ روزِ جزا میں وہ میری خطا معاف فرمادے گا۔

وہ نہ صرف اپنے لئے بلکہ اپنے والدین اور تمام اہلِ ایمان کے لئے بھی مغفرت اور بخشش کی دعا کرتے تھے:

رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ ۝ (ابراھیم: ۴۱)	پروردگار مجھے اور میرے والدین کو اور سب ایمان لانے والوں کو اس دن معاف کر دیجیو جب کہ حساب قائم ہوگا۔

اس اعلیٰ ترین صفت کا پرتو حضرت ابراہیمؑ پر ایمان لانے والوں پر بھی پڑا تھا چنانچہ ان کی طرح وہ بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جبینِ نیاز خم کرتے، اس کی طرف رجوع ہوتے، اس سے مدد چاہتے اور اپنے گناہوں اور لغزشوں پر اس سے مغفرت طلب کرتے تھے۔ ان کی دعا یہ ہوتی تھی:

رَبَّنَا عَلَیْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَیْكَ اَنَبْنَا وَاِلَیْكَ الْمَصِیْرُ ۝ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ (الممتحنة: ۴)	اے ہمارے رب! تیرے ہی اوپر ہم نے بھروسہ کیا اور تیری ہی طرف ہم نے رجوع کر لیا اور تیرے ہی حضور ہمیں پلٹنا ہے۔ اے ہمارے رب ہمیں کافروں کے لئے فتنہ نہ بنا دے۔ اور اے ہمارے رب ہمارے قصوروں سے درگذر فرما۔

بے شک تو ہی زبردست اور دانا ہے۔

۴۔ شکر

اللہ تعالیٰ کے احسانات و انعامات کا احساس بندے میں شکر کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اور اس میں مزید تذلل، خشوع و خضوع اور اطاعت و فرمانبرداری پروان چڑھتی ہے۔ حضرت ابراہیم ؑ کے اندر یہ صفت بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔ ان کا دل اپنے رب کی نعمتوں پر تشکر و امتنان کے جذبات سے لبریز رہتا تھا۔ جس کا اظہار ان کی زبان سے بھی ہوتا تھا۔ قرآن کہتا ہے:

شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهِ (النحل: ۱۲۱) — اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والا تھا۔

انعم، جمع قلت کا صیغہ ہے۔ اس سے یہ لطیف اشارہ مقصود ہے کہ حضرت ابراہیم اس وقت بھی اللہ کے شکر گذار تھے جب وہ ابھی زیادہ انعاماتِ الٰہی سے بہرہ ور نہیں ہوئے تھے۔[۲۴] اگر کسی شخص پر انعام و اکرام کی بارش ہو جائے تب وہ اپنے محسن کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہو۔ اس میں کوئی ندرت نہیں ہے۔ قابلِ تعریف تو وہ شخص ہے جو معمولی احسان کو بھی مانے اور قلیل نعمتوں پر بھی شکر گذار ہو۔

حضرت ابراہیم ؑ کی قوم آبا و اجداد کی تقلید میں بتوں کو پوجتی تھی۔ انھوں نے اس کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی۔ اس موقع پر انھوں نے اپنی مثال دی کہ میں تو اس رب العالمین کی پرستش کرتا ہوں جس نے مجھ پر ان گنت احسانات کیے ہیں۔ ان احسانات کا تقاضا ہے کہ صرف اسی کی عبادت کی جائے:

فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّي إِلَّا رَبَّ الْعَالَمِينَ ۝	میرے تو یہ سب دشمن ہیں۔ بجز ایک
الَّذِي خَلَقَنِي فَهُوَ يَهْدِينِ ۝	رب العالمین کے۔ جس نے مجھے پیدا کیا
وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِ ۝	پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے۔ جو مجھے
وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ ۝	کھلاتا اور پلاتا ہے۔ اور جب بیمار ہو جاتا
وَالَّذِي يُمِيتُنِي ثُمَّ يُحْيِينِ ۝	ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے۔ جو مجھے
وَالَّذِي أَطْمَعُ أَنْ يَغْفِرَ لِي	موت دے گا اور پھر دوبارہ مجھ کو زندگی
خَطِيئَتِي يَوْمَ الدِّينِ ۝	بخشے گا اور جس سے میں امید رکھتا ہوں

(الشعراء: ۷۷تا۸۲) کہ روزِ جزا میں وہ میری خطا معاف فرمادے گا۔

انھوں نے قوم کو بھی متوجہ کیا کہ جو اسبابِ زندگی تمہیں حاصل ہیں وہ ان کی طرف سے نہیں ہیں جن کی تم پرستش کرتے ہو بلکہ ان سے تمہیں اللہ تعالیٰ نے نوازا ہے۔ اس لئے اس کا شکر ادا کرو اور صرف اسی کی عبادت بجالاؤ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ	درحقیقت اللہ کے سوا جن کی تم
اللّٰہِ لَا یَمْلِکُوْنَ لَکُمْ رِزْقًا	پرستش کرتے ہو وہ تمہیں کوئی رزق
فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰہِ الرِّزْقَ	بھی دینے کا اختیار نہیں رکھتے۔ اللہ
وَاعْبُدُوْہُ وَاشْکُرُوْا لَہٗ ط	سے رزق مانگو اور اسی کی بندگی کرو
اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ	اور اس کا شکر ادا کرو۔ اسی کی طرف
(العنکبوت: ۱۷)	تم پلٹائے جانے والے ہو۔

اپنے وطن سے ہجرت کرنے کے وقت تک حضرت ابراہیمؑ کے کوئی اولاد نہ تھی۔ ان کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ ان کے یہاں کوئی بچہ ہو جو ان کے کاموں میں مددگار، بڑھاپے کا سہارا اور ان کی دعوت کو جاری رکھنے والا ہو۔ انھوں نے بارگاہِ الٰہی میں دعا کے لئے ہاتھ پھیلادئے (الصافات: ۱۰۰) اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشا اور انھیں دو اولادیں عطا کیں۔ حضرت ہاجرہ سے اسماعیلؑ اور حضرت سارہ سے اسحاقؑ پیدا ہوئے۔ دعا کی مقبولیت پر حضرت ابراہیمؑ کا دل جذبۂ تشکر سے بھر گیا جس کا اظہار ان کی زبان مبارک سے یوں ہوا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ وَھَبَ لِیْ عَلَی	شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے اس
الْکِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ	بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق جیسے
اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ	بیٹے دئے۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا رب
(ابراھیم: ۳۹)	ضرور دعا سنتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کو مکہ کی وادی میں لا بسایا تھا۔ اس وقت وہ جگہ بالکل غیر آباد تھی۔ سنگلاخ زمین کی وجہ سے سبزہ اگتا تھا نہ پیداوار ہوتی تھی۔

حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اس ویرانے کو آباد کردے اور وہاں کے باشندوں کے لئے اسبابِ معاش کی فراوانی کردے:

رَبَّنَا اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ	پروردگار میں نے ایک بے آب وگیاہ
بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ	وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو
الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ	تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔
فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ	پروردگار یہ میں نے اس لئے کیا ہے کہ یہ
تَھْوِیْٓ اِلَیْھِمْ وَارْزُقْھُمْ	لوگ یہاں نماز قائم کریں۔ لہٰذا تو لوگوں
مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّھُمْ یَشْکُرُوْنَ	کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور انھیں
(ابراھیم: ۳۷)	کھانے کو پھل دے۔ شاید کہ یہ شکر گذار بنیں۔

آیت کے آخر میں لَعَلَّھُمْ یَشْکُرُوْنَ کے جو الفاظ آئے ہیں وہ نہایت معنی خیز ہیں۔ یعنی میں ان کے لئے جو سکون کی زندگی SETTLED LIFE کا طالب ہوں تو اس لئے نہیں کہ ان کے لئے سامانِ عیش کی فراوانی چاہتا ہوں بلکہ صرف اس لئے اس کا طالب ہوں کہ وہ اپنے مشن کے لئے یکسو رہ کر زیادہ سے زیادہ تیری شکر گذاری کا حق ادا کر سکیں۔[۲۵]

۵۔ دعا

دعا اللہ تعالیٰ سے قریب ہونے کا ایک ذریعہ بھی ہے اور بندے اور اس کے رب کے درمیان قربت جاننے کا ایک پیمانہ بھی۔ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بندے کی جانب سے اپنے عجز و درماندگی، بے چارگی و محتاجی اور عبدیت کا اظہار بھی ہے اور اللہ کی قدرت کاملہ، شانِ بے نیازی اور معبودیت کا اعتراف بھی۔ اسی لئے قرآن و حدیث میں دعا کی بڑی فضیلت آئی ہے اور اس کی بہت تاکید کی گئی ہے۔[۲۶] حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سیرت طیبہ میں یہ پہلو ہمیں بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ توحید کی صدا بلند کرنے کے بعد اپنے باپ اور قوم کی جانب سے انھیں بہت سی تکلیفیں اٹھانی پڑیں مگر انھوں نے ان کے حق میں دعائے خیر ہی کی۔ بالآخر جب انھیں ہجرت کرنے پر مجبور ہونا پڑا تو اس وقت بھی انھوں نے یہی فرمایا:

وَاَعۡتَزِلُكُمۡ وَمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَاَدۡعُوۡ رَبِّیۡ ۖ عَسٰۤى اَلَّاۤ اَكُوۡنَ بِدُعَآءِ رَبِّیۡ شَقِيًّا (مریم: ۴۸)	میں آپ لوگوں کو بھی چھوڑتا ہوں اور ان ہستیوں کو بھی جنھیں آپ لوگ خدا کو چھوڑ کر پکارا کرتے ہیں۔ میں تو اپنے رب ہی کو پکاروں گا۔ امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر نامراد نہ رہوں گا۔

ہجرت کرنے کے بعد بھی وہ اپنے باپ کے لئے برابر دعائے خیر کرتے رہے۔ اور اس سے اس وقت تک نہ رکے جب تک کہ واضح نہ ہو گیا کہ اسے ہدایت کی توفیق نہیں ملی۔ یہ بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيۡمٌ (التوبۃ: ۱۱۴)	حق یہ ہے کہ ابراہیم بڑا رقیق القلب وخدا ترس اور بردبار آدمی تھا۔

اسی طرح جب "مہمان" بن کر آنے والے فرشتوں نے انھیں خبر دی کہ وہ قوم لوط کو ــــــ جس کی نافرمانیاں اور سرکشیاں حد سے تجاوز کر گئی ہیں۔ ہلاک کرنے آئے ہیں۔ تو اس موقع پر بھی حضرت ابراہیمؑ نے اللہ کی بارگاہ میں دعا کے لئے ہاتھ پھیلا دئے اور عرض کیا کہ اگر اس بستی میں ابھی کچھ صالح لوگ ہوں تو ان کی بدولت ابھی اس قوم کو کچھ اور مہلتِ عمل دے دے۔ اس سیاق میں قرآن کہتا ہے:

اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ لَحَلِيۡمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيۡبٌ (ھود: ۷۵)	حقیقت میں ابراہیم بڑا حلیم اور نرم دل آدمی تھا اور ہر حال میں ہماری طرف رجوع کرتا تھا۔

مذکورہ دونوں آیتوں میں ایک لفظ "اوّاہ" آیا ہے۔ اس کے مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن شدادؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مجلس میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص نے آکر سوال کیا: اے اللہ کے رسول 'اوّاہ' کے کیا معنی ہیں؟ آپ نے فرمایا: 'خشوع اختیار کرنے اور تضرع کرنے والا'۔ پھر آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيۡمٌ[۵۲]

حضرات زر بن حُبیش اور ابوعبیدہ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کیا ہے کہ 'اواہ' کے معنی کثرت سے دعا کرنے والے کے ہیں۔[۴۸]

اہلِ تفسیر نے اس کے دیگر معانی بھی بیان کئے ہیں لیکن علامہ طبری نے اسی معنی (یعنی دعا) کو ترجیح دی ہے۔ اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ سورۂ توبہ کی درج بالا آیت میں حضرت ابراہیمؑ کے اپنے باپ کے لئے دعا و استغفار کرنے کے وعدے کا ذکر ہے۔[۴۹]

قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مختلف مواقع کی دعائیں نقل ہوئی ہیں۔ ان کے مطالعے سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ کس طرح حضرت ابراہیم تضرع اور عاجزی کے ساتھ اپنے رب کے آگے ہاتھ پھیلاتے تھے۔ اس کے سامنے اپنی ضروریات رکھتے تھے۔ اپنی آرزوئیں اور تمنائیں بیان کرتے تھے۔ اس سے مغفرت طلب کرتے تھے اور دنیا و آخرت میں کامیابی کی دعا کرتے تھے۔ ان دعاؤں کو سطورِ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

۱۔ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى (البقرہ: ۲۶۰) — میرے مالک مجھے دکھادے تو مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے۔

قرآن میں جس جگہ یہ دعا مذکور ہے وہاں آگے ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ نے سوال کیا کہ کیا اس بات پر تمہارا ایمان نہیں؟ حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا: ایمان تو ہے البتہ چاہتا ہوں کہ میرا دل پوری طرح مطمئن ہوجائے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو شرفِ قبولیت بخشا اور احیائے موتیٰ کی کیفیت کا مشاہدہ کرایا۔

۲۔ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (الصافات: ۱۰۰) — اے پروردگار مجھے ایک بیٹا عطا کر جو صالحوں میں سے ہو۔

یہ دعا حضرت ابراہیمؑ نے اپنے وطن سے ہجرت کرتے وقت کی تھی۔ اس وقت تک وہ لاولد تھے۔ اس کی قبولیت کے نتیجے میں پہلے ان کے یہاں حضرت اسماعیلؑ کی ولادت ہوئی۔ پھر حضرت اسحاقؑ کی۔

۳۔ رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝ وَاجْعَلْ لِّيْ — اے میرے رب مجھے حکم عطا کر اور مجھکو صالحوں کے ساتھ ملا۔ اور بعد کے آنے

لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝
وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ
النَّعِيْمِ ۝ وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ
كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝ وَلَا تُخْزِنِيْ
يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ۝ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ
مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ اَتَى
اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۝
(الشعراء: ۸۳-۸۹)

والوں میں مجھ کو سچی ناموری عطا کر۔
اور مجھے جنت نعیم کے وارثوں میں شامل
فرما۔ اور میرے باپ کو معاف کردے
کہ بے شک وہ گمراہ لوگوں میں سے ہے
اور مجھے اس دن رسوا نہ کر جب کہ سب
لوگ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے۔
جب کہ نہ مال کوئی فائدہ دے گا نہ اولاد
بجز اس کے کہ کوئی شخص قلب سلیم لئے
ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہو۔

حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا بھی ہجرت کے موقع کی ہے۔ اس میں 'حکم' سے مراد علم، حکمت، فہم اور صحیح قوتِ فیصلہ ہے۔ اور 'سچی ناموری (لسان صدق) طلب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بعد کی نسلیں مجھے خیر کے ساتھ یاد کریں اور میری زندگی رہتی دنیا تک خلقِ خدا کے لئے روشنی کا مینار بنی رہے۔[۱۶]

۴۔ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا
وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ
اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ
(البقرۃ: ۱۲۶)

اے میرے رب اس شہر کو امن کا شہر
بنادے اور اس کے باشندوں میں سے جو
اللہ اور آخرت کو مانیں انھیں ہر قسم کے
پھلوں کا رزق دے۔

۵۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ
السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَ
اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ
ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ
وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا
اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝
رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا

اے ہمارے رب ہم سے یہ خدمت قبول
فرمالے۔ تو سب کی سننے اور سب کچھ جاننے
والا ہے۔ اے رب ہم دونوں کو اپنا مسلم
(مطیع فرماں) بنا۔ ہماری نسل سے ایک ایسی
قوم اٹھا جو تیری مسلم ہو۔ ہمیں اپنی عبادت
کے طریقے بتا اور ہماری کوتاہیوں سے در
گذر فرما۔ تو بڑا معاف کرنے والا اور رحم

مِنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَ الۡحِكۡمَةَ وَيُزَكِّيۡهِمۡ ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ۝
(البقرہ: ۱۲۷-۱۲۹)

فرمانے والا ہے۔ اور اے رب ان لوگوں میں خود انہی کی قوم سے ایک رسول اٹھائیو جو انھیں تیری آیات سنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے۔ تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے۔

مذکورہ دونوں دعائیں خانۂ کعبہ کی تعمیر کے وقت کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل کے ساتھ مل کر خالص اس کی عبادت کے لئے ایک گھر بنایا۔ اس موقع پر اپنی نسل اور اپنی دعوت پر ایمان لانے والوں کی مادی اور روحانی بھلائی کے لئے بھی دعا کی۔

۶۔ رَبِّ اجۡعَلۡ هٰذَا الۡبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجۡنُبۡنِىۡ وَبَنِىَّ اَنۡ نَّعۡبُدَ الۡاَصۡنَامَ ۝ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضۡلَلۡنَ كَثِيۡرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنۡ تَبِعَنِىۡ فَاِنَّهٗ مِنِّىۡ ۚ وَمَنۡ عَصَانِىۡ فَاِنَّكَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۝ رَبَّنَاۤ اِنِّىۡۤ اَسۡكَنۡتُ مِنۡ ذُرِّيَّتِىۡ بِوَادٍ غَيۡرِ ذِىۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَيۡتِكَ الۡمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ فَاجۡعَلۡ اَفۡـئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهۡوِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ وَارۡزُقۡهُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمۡ يَشۡكُرُوۡنَ ۝

پروردگار اس شہر (یعنی مکہ) کو امن کا شہر بنا اور مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا۔ پروردگار ان بتوں نے بہتوں کو گمراہی میں ڈالا ہے ممکن ہے میری اولاد کو بھی یہ گمراہ کر دیں۔ لہٰذا ان میں سے) جو میرے طریقے پر چلے وہ میرا ہے اور جو میرے خلاف طریقہ اختیار کرے تو یقیناً تو درگذر کرنے والا مہربان ہے۔ پروردگار میں نے ایک بے آب وگیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ پروردگار یہ میں نے اس لئے کیا ہے کہ یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں۔ لہٰذا تو

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۝ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ ۝ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ ۝ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ۝

(ابراھیم: ۳۸-۴۱)

لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور انھیں کھانے کو پھل دے۔ شاید کہ یہ شکر گذار بنیں۔ پروردگار تو جانتا ہے جو کچھ ہم چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں اور واقعی اللہ سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے۔ نہ زمین میں نہ آسمانوں میں۔ شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے اس بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق جیسے بیٹے دیے۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا رب ضرور دعا سنتا ہے۔ اے میرے پروردگار مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد سے بھی ایسے لوگ اٹھا جو یہ کام کریں۔ پروردگار میری دعا قبول کر۔ پروردگار مجھے اور میرے والدین کو اور سب ایمان لانے والوں کو اس دن معاف کیجیو جب کہ حساب قائم ہوگا۔

مضمون آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا اس وقت کی تھی جب مکہ آباد ہو چکا تھا۔ اسحاقؑ پیدا ہو چکے تھے۔ اور حضرت ابراہیم پر اپنے باپ کے 'دشمنِ خدا' ہونے کا انکشاف نہیں ہوا تھا[۳۱]

ان دعاؤں کے مضامین پر غور کیا جائے تو ان سے ہمیں یہ رہنمائی ملتی ہے کہ ایک مومن کو اپنے رب سے کیسی دعائیں مانگنی چاہئیں؟ ان میں علم و حکمت، فہم و فراست، اور دانش مندی کی طلب ہے۔ اپنے گناہوں پر مغفرت کی استدعا ہے۔ آخرت میں ناکامی اور رسوائی سے بچانے کی التجا ہے۔ صالح جانشین کی خواہش کا اظہار ہے۔ اور مادی اور روحانی بھلائیوں کی آرزو ہے۔ اگر مادی آسائش بھی طلب کی گئی ہے تو محض اس لئے کہ اس کے ذریعے شکر گذاری کا جذبہ پیدا ہو۔

ان دعاؤں کا ایک دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ ان سے دعا کرنے کا طریقہ اور اس کے آداب معلوم ہوتے ہیں۔ مفسرین نے ان میں سے بعض آداب کی طرف اشارہ کیا ہے:

۱۔ سورۂ شعراء آیات: ۸۳۔۸۹ میں حضرت ابراہیمؑ کی جو دعا مذکور ہے اس سے پہلے انھوں نے تفصیل سے وہ احسانات گنائے ہیں جو ان پر اللہ تعالیٰ نے کئے ہیں۔ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ بارگاہِ الٰہی میں دستِ طلب دراز کرتے وقت اس کے احسانات، اس کی بے پایاں نوازشوں اور کرم فرمائیوں کا واسطہ دینا چاہئے اور ان کے وسیلے سے دعا کرنی چاہئے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں:

"ان آیات میں پہلے حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ کی ثناء بیان کی پھر اس سے دعا کی اور اس کے سامنے دستِ سوال دراز کیا۔ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ دعا سے قبل اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کرنا اہمیت رکھتا ہے۔"[۳۲]

۲۔ حضرت ابراہیمؑ دعا کرتے وقت بار بار "رَبِّ" (اے میرے رب) یا "رَبَّنَا" (اے ہمارے رب) فرماتے ہیں۔ اس طرح رحمتِ الٰہی کو اپنی طرف منعطف کراتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا میں ایسے الفاظ استعمال کرنا پسندیدہ ہے۔ سورہ ابراہیم آیات: ۳۵۔۴۱ کے ذیل میں مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے:

"اس دعا میں دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ سات[۳۳] مرتبہ 'رَبِّ' یا 'رَبَّنَا' کا لفظ آیا ہے۔ یوں بظاہر تو یہ ایک تکرار ہی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ چیز دعا کی خصوصیات بلکہ اس کے لوازم میں سے ہے۔ دعا کا اصل مزاج تضرع، استمالت، استغاثہ اور التجا و فریاد ہے۔ یہ چیز مقتضی ہوتی ہے کہ جس سے دعا کی جا رہی ہے اس کو بار بار متوجہ کیا جائے۔ جب بندہ خدا کو ربّی سے خطاب کرتا ہے تو وہ گویا اس لطفِ خاص کو اپنی دعا کے حق میں سفارشی بناتا ہے جس کا تجربہ اسے خود ہے اور جب اس کو رَبَّنا سے خطاب کرتا ہے تو وہ اس کے اس کرمِ عام کو اپنی دعا کے حق میں سفارشی بناتا ہے جس کا مشاہدہ تمام خلق میں ہو رہا ہے۔"[۳۴]

۳۔ دعا کا ایک ادب یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس قسم کی دعا مانگی جائے اس کے مناسب صفاتِ الٰہی کا استعمال کیا جائے۔ حضرت ابراہیمؑ دعا کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہیں تو ساتھ ہی یہ بھی

فرماتے ہیں "میرا رب ضرور دعا سنتا ہے" اللہ تعالیٰ سے اپنی کوتاہیوں پر معافی مانگتے ہیں تو ساتھ ہی یہ بھی عرض کرتے ہیں "تو بڑا معاف کرنے والا ہے" مولانا امین احسن اصلاحی نے اس پہلو کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

"دعا کے بیچ بیچ میں بار بار 'رَبَّنَا' کا اعادہ اور دعا کے مناسب صفاتِ الٰہی کا حوالہ دعا کے آداب میں سے ہے۔ اس سے دعا شرفِ قبولیت حاصل کرتی ہے۔ یہ دعا ان دونوں چیزوں کے حکیمانہ استعمال کی بہترین مثال ہے"[۳۵]

۴۔ حضرت ابراہیم جب دعا کرتے ہیں تو صرف اپنی ذات کو پیش نظر نہیں رکھتے بلکہ اپنے والدین اپنی نسل اور تمام اہلِ ایمان کی بھلائی کے بھی خواہاں رہتے ہیں۔ وہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی نسل کو بھی مادی اور روحانی نعمتوں سے بہرہ ور کردے۔ اس سے دعا کا ایک ادب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کو اپنے ساتھ اپنے والدین اور اپنی نسل کی بھلائی کے لئے بھی دعا کرنی چاہیئے، علامہ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے:

"ہر دعا کرنے والے کو چاہیئے کہ اپنے لئے دعا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ماں باپ اور اپنی اولاد کے لئے بھی دعا کرے"[۳۶]

۶۔ عبادت گذاری

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب زندگی کے ہر معاملہ میں مرضیٔ رب کو پیشِ نظر رکھتے تھے اور اس کی اطاعت کی طرف سبقت کرتے تھے تو ظاہر ہے کہ عبادات کے معاملہ میں بھی وہ عالی مقام پر فائز ہوں گے۔ قرآن نے ان کی عبادت گذاری کا بانداز تحسین تذکرہ کیا ہے۔ سورۂ انبیاء میں اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیمؑ پر اپنے احسانات و انعامات گناتا ہے کہ ہم نے اسے اسحاقؑ اور یعقوبؑ عطا کئے۔ ان سب کو صالح بنایا اور انھیں امامت کے منصب پر فائز کیا (آیت: ۷۲) پھر فرماتا ہے:

وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ	اور ہم نے انھیں وحی کے ذریعے نیک
وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ	کاموں کی اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ
وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۝	دینے کی ہدایت کی اور وہ ہمارے عبادت

(الانبیاء: ۷۳) گذار تھے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اولاد کو دیگر نیک کاموں کے ساتھ خاص طور پر نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ جسے وہ ٹھیک ٹھیک بجالائے۔ عبادت گذاری کا اس سے بلند مقام اور کیا ہو سکتا ہے کہ خود معبود اس کی شہادت دے۔

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے دوسرے بیٹے حضرت اسماعیل کو بے آب و گیاہ وادی میں لا بسایا تو اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ یہاں وہ اور ان کی نسل پر سکون زندگی گذارتے ہوئے خدائے واحد کی عبادت کریں (ابراہیم: ۳۷) حضرت ابراہیمؑ اپنے رب سے اس کی توفیق کی دعا بھی مانگا کرتے تھے:

رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ	پروردگار مجھے نماز قائم کرنے والا بنا
وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ	اور میری اولاد سے بھی (ایسے لوگ اٹھا

(ابراھیم: ۴۰) جو یہ کام کریں)۔

"بائبل میں بعض مواقع پر "سرنگوں ہونے" کی تعبیر اختیار کی گئی ہے مثلاً:

"خداوند ابرام کو نظر آیا اور اس سے کہا کہ میں خدای قادر ہوں۔ تو میرے حضور چل اور کامل ہو اور میں اپنے اور تیرے درمیان عہد باندھوں گا اور تجھے بہت زیادہ بڑھاؤں گا۔ تب ابرام سرنگوں ہو گیا"[۳۷]

"اور خدا نے ابرام سے کہا کہ ساری جو تیری بیوی ہے اس کو ساری نہ پکارنا۔ اس کا نام سارہ ہوگا اور میں اسے برکت دوں گا اور اس سے تجھے ایک بیٹا بخشوں گا۔ یقیناً میں اسے برکت دوں گا اور قومیں اس کی نسل سے ہوں گی اور عالم کے بادشاہ اس سے پیدا ہوں گے۔ تب ابرام سرنگوں ہوا"[۳۸]

عین ممکن ہے کہ "سرنگوں ہونے" کی تعبیر نماز ہی کے لئے اختیار کی گئی ہو۔

خانہ کعبہ کی دیواریں اٹھاتے وقت حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا "وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا" (البقرہ: ۱۲۸) اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے انھیں حج کا طریقہ سکھایا۔ ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ دوسرے لوگوں میں بھی

اس کا اعلان عام کردیں (الحج: ۲۷)

۷۔ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک سیرت ابراہیمی کا ایک درخشاں باب ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے شعور کی آنکھیں کھولیں تو بت پرستی کا بازار گرم پایا۔ خود ان کا گھر بت پرستی کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ان کا باپ نہ صرف بُت تراشتا تھا۔ بلکہ وہ پروہت کے منصب پر بھی فائز تھا۔ حضرت ابراہیمؑ اپنی فطرتِ سلیم سے اس نتیجہ پر پہنچے کہ مٹی پتھر کے یہ بت اس قابل نہیں کہ ان کے آگے جبینِ نیاز خم کی جائے۔ پھر جب انھیں بارگاہِ الٰہی سے "علم یقینی" حاصل ہوا اور گمراہ انسانوں کو سیدھی راہ دکھانے کا حکم ملا تو سب سے پہلے انھوں نے اپنے باپ کو اپنی دعوت کا مخاطب بنایا۔ انھوں نے اس کا ادب و احترام ملحوظ رکھتے ہوئے انتہائی دل سوزی، محبت اور اپنائیت کے ساتھ اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ فرمایا:

يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا	ابا جان آپ کیوں ان چیزوں کی عبادت
يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي	کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں اور
عَنكَ شَيْئًا ۝ يَا أَبَتِ إِنِّي	نہ آپ کا کوئی کام بنا سکتی ہیں؟ ابا جان
قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ	میرے پاس ایک ایسا علم آیا ہے جو آپ کے
يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ	پاس نہیں آیا۔ آپ میرے پیچھے چلیں میں
صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ يَا أَبَتِ لَا تَعْبُدِ	آپ کو سیدھا راستہ بتاؤں گا۔ ابا جان
الشَّيْطَانَ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ	آپ شیطان کی بندگی نہ کریں شیطان تو
لِلرَّحْمَٰنِ عَصِيًّا ۝ يَا أَبَتِ إِنِّي	رحمٰن کا نافرمان ہے۔ ابا جان مجھے ڈر ہے
أَخَافُ أَن يَمَسَّكَ عَذَابٌ	کہ کہیں آپ رحمٰن کے عذاب میں مبتلا
مِّنَ الرَّحْمَٰنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطَانِ	نہ ہو جائیں اور شیطان کے ساتھی بن کر
وَلِيًّا ۝ (مریم: ۴۲-۴۵)	رہیں۔

ان آیات میں 'یا ابت' کی تکرار پر غور کیجئے۔ اس لفظ سے جو پیار، محبت، اپنائیت اور

ادب واحترام مترشح ہے وہ عربی زبان کا ذوق رکھنے والوں سے مخفی نہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں:

"اس تقریر میں یا أبتِ (اے میرے باپ) کی تکرار حضرت ابراہیمؑ کی دل سوزی، دردمندی اور استمالت کی دلیل ہے۔ ایک سعادت مند بیٹے کے اندر باپ کی گمراہی سے جو تعلق خاطر اور جو اضطراب ہونا چاہیئے وہ فقرے فقرے سے نمایاں ہے۔"[۱۹]

امام رازیؒ نے ان آیات پر مزید روشنی ڈالی ہے اور ان کے فنی محاسن آشکارا کیئے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"جاننا چاہیئے کہ حضرت ابراہیمؑ کے اس کلام کی ترتیب میں انتہائی حسن پایا جاتا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے اپنے باپ کو ان چیزوں کی طرف متوجہ کیا جو بت پرستی کا باطل ہونا واضح کرتی ہیں۔ اس کے بعد غور وتدبر کرنے اور اندھی تقلید سے اجتناب کرنے کے معاملے میں اپنی اتباع کی دعوت دی۔ پھر بتایا کہ شیطان کی اطاعت عقلمندوں کے لئے جائز نہیں ہے۔ آخر میں ایک ایسی وعید کا تذکرہ کیا جو انسان کو ناپسندیدہ کاموں سے روک دے۔

حضرت ابراہیم نے یہ باتیں لطف ومحبت کے پیرائے میں اور نرم لہجے میں کہیں۔ ان کا اپنی ہر بات کے شروع میں 'یا أبتِ' کہنا اس چیز پر دلالت کرتا ہے کہ انھیں اپنے باپ سے شدید محبت تھی اور وہ اسے سزائے الٰہی سے بچانے اور راہِ راست کی طرف لانے کی شدید خواہش رکھتے تھے۔ آخر میں انھوں نے فرمایا "إِنِّيٓ أَخَافُ ..." (مجھے ڈر ہے .....) اس سے اشارہ ملتا ہے کہ وہ اپنے باپ کے مفادات کو بہت زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

حضرت ابراہیمؑ کا یہ باتیں کہنا متعدد وجوہ سے تھا۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اس طرح وہ اپنے باپ کے حقوق ادا کرنا چاہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے۔ اور دین کی طرف رہنمائی سے بڑھ کر حسنِ سلوک

اور کیا ہو سکتا ہے۔ پھر اگر اس کے ساتھ ادب و احترام بھی ملحوظ رکھا جائے اور بہت نرم لہجے میں یہ باتیں کہی جائیں تو یہ نورٌ علیٰ نور ہے۔[۴۵]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس محبت، خیر خواہی اور دردمندی کا ان کے باپ کی جانب سے کیا جواب ملا؟ قرآن نے اس کو بھی بیان کیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی ان باتوں کو سن کر وہ بہت چراغ پا ہوا۔ ترش لہجے میں دھمکاتے ہوئے کہنے لگا:

اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ	ابراہیم کیا تو میرے معبودوں سے پھر
یٰۤاِبْرٰهِیْمُ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ	گیا ہے، اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے
لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا	سنگ سار کر دوں گا۔ بس تو ہمیشہ
(مریم: ۴۶)	کے لئے مجھ سے الگ ہو جا۔

'رجم' کے لغوی معنی سنگ سار کرنے، قتل کرنے کے آتے ہیں۔ استعارۃً اسے بُرا بھلا کہنے اور دھتکارنے کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں اس سے دونوں معانی مراد لئے جا سکتے ہیں۔[۴۶] 'ملیا' کی مفسرین نے دو توجیہیں کی ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے معنی ہیں طویل عرصہ یعنی تم ہمیشہ کے لئے میرے سامنے سے دفع ہو جاؤ، اس کے دوسرے معنی ہیں بچنا، محفوظ رہنا، یعنی اگر میری سزا سے بچنا چاہتے ہو تو میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ امام طبریؒ نے مؤخر الذکر معنی کو ترجیح دی ہے۔[۴۷]

پیار و محبت اور ہمدردی و خیر خواہی کے جواب میں اپنے باپ کی سخت سست باتوں، ڈانٹ ڈپٹ، غصہ اور دھتکار کا حضرت ابراہیمؑ نے بُرا نہ مانا۔ بلکہ اسی دل سوزی کے ساتھ اسے سمجھاتے رہے۔ بالآخر جب انھوں نے محسوس کر لیا کہ اس کی سخت روی اور سنگ دلی کی بنا پر اب مزید کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں رہی تو اس سے علیحدگی اختیار کر لینے ہی کو بہتر سمجھا۔ مگر اس موقع پر بھی انھوں نے اپنے باپ پر واضح کر دیا کہ وہ اس کے گناہوں پر مغفرت اور اس کی ہدایت کے لئے بارگاہ الٰہی میں دعا کرتے رہیں گے۔

انھوں نے اس سے رخصت ہوتے وقت فرمایا:

سَلٰمٌ عَلَیْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ	سلام ہے آپ کو۔ میں اپنے رب سے دعا

رَبِّیْ اِنَّہٗ کَانَ بِیْ حَفِیًّاہ	کروں گا کہ آپ کو معاف کر دے۔ میرا رب
(مریم: ۴۷)	مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے: "باپ کے اس سنگ دلانہ رویہ کے باوجود حضرت ابراہیمؑ کا اس سے دعائے مغفرت کا وعدہ کرنا ان کی غایت درجہ دردمندی اور رقتِ قلب کی دلیل ہے"[۴۳]

سورۂ مریم کی درج بالا آیت میں صرف، مغفرت کی دعا کرنے کے وعدہ کا ذکر ہے۔ البتہ سورۂ ممتحنہ میں ہے کہ انھوں نے ساتھ ہی مزید یہ بھی فرمایا تھا:

وَمَآ اَمْلِکُ لَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنْ	اور اللہ سے آپ کے لئے کچھ حاصل
شَیْءٍ (الممتحنۃ: ۴)	کر لینا میرے بس میں نہیں ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے اس وعدہ کو پوری طرح نبھایا۔ چنانچہ ہجرت کے بعد ایک موقع پر جب انھوں نے بارگاہِ الٰہی میں دعا کے لئے ہاتھ پھیلائے تو باپ کی مغفرت بھی چاہی:

وَاغْفِرْ لِاَبِیْٓ اِنَّہٗ کَانَ مِنَ	اور میرے باپ کو معاف کرے کہ بے
الضَّآلِّیْنَ ہ (الشعراء: ۸۶)	شک وہ گمراہ لوگوں میں ہے۔

مکّہ آباد ہو جانے کے بعد ایک موقع پر انھوں نے جو دعا کی تھی اس میں اپنے باپ کے ساتھ ساتھ اپنی ماں کی مغفرت بھی طلب کی تھی:

رَبَّنَا اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ	پروردگار مجھے اور میرے والدین کو اور
یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ ہ	سب ایمان لانے والوں کو اس دن
(ابراھیم: ۴۱)	معاف کر دیجیو جب کہ حساب قائم ہوگا

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے باپ سے علیحدگی اور وطن سے ہجرت کے بعد ایک طویل عرصہ تک وہ یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ وہ ہدایت یاب ہو اور اللہ کی رحمت و مغفرت اسے ڈھانپ لے۔ لیکن جب انھیں یقین ہو گیا کہ وہ رحمت الٰہی کا مستحق نہیں ہے تو اس کے لئے مغفرت کی دعا بند کر دی:

وَمَا کَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰھِیْمَ	ابراہیم نے اپنے باپ کے لئے جو دعائے

لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ	مغفرت کی تھی وہ تو اس وعدے کی وجہ
اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ	سے تھی جو اس نے اپنے باپ سے کیا تھا۔
عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ	مگر جب اس پر یہ بات کھل گئی کہ اس کا
(التوبۃ: ۱۱۴)	باپ خدا کا دشمن ہے تو وہ اس سے بیزار
	ہو گیا۔

حضرت ابراہیمؑ پر کب اور کیسے واضح ہوا کہ ان کا باپ اللہ کا دشمن ہے اس لئے اس کی مغفرت کا مستحق نہیں ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین سے مختلف اقوال مروی ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ جب تک وہ زندہ رہا حضرت ابراہیمؑ اس کے لئے دعائے مغفرت کرتے رہے لیکن جب بحالتِ شرک اس کی موت کا انھیں علم ہو گیا تو استغفار سے رک گئے۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ وہ استغفار سے اسی وقت رکے جب اللہ تعالیٰ نے انھیں خبر دی کہ اب اس پر حجت تمام ہو چکی ہے، وہ ایمان لانے والا نہیں ہے۔ اس لئے اس کا پیچھا چھوڑ دو۔[۴۴]

۸۔ مہمان نوازی

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سیرت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے مہمان نواز تھے۔ بعض روایات میں مہمان نوازی کو ان کی اولیات میں شمار کیا گیا ہے: اول من قری الضیف[۴۵] اول من اضاف الضیف[۴۶] بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی مہمان کو اپنے ساتھ شریک کئے بغیر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات مہمان کی تلاش میں دو دو میل تک نکل جاتے تھے۔[۴۷] حضرت ابراہیمؑ کی مہمان نوازی کے اثبات کے لئے ان روایات کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں۔ خود قرآن نے ان کی مہمان نوازی کو بڑے دل کش انداز میں بیان کیا ہے:

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ	اے نبی۔ ابراہیم کے معزز مہمانوں کی
اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ۘ اِذْ	حکایت بھی تمہیں پہنچی ہے؟ جب وہ
دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا	اس کے یہاں آئے تو کہا آپ کو سلام
قَالَ سَلٰمٌ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ۘ	ہے۔ اس نے کہا "آپ لوگوں کو بھی

فَرَاغَ اِلٰۤی اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ	سلام ہے ۔کچھ ناآشنا سے لوگ ہیں ۔
سَمِیْنٍۙ فَقَرَّبَهٗۤ اِلَیْهِمْ	پھر وہ چپکے سے اپنے گھر والوں کے پاس گیا
قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۚ فَاَوْجَسَ	اور ایک (بھنا ہوا) موٹا تازہ بچھڑا لا کر
مِنْهُمْ خِیْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ	مہمانوں کے آگے پیش کیا ۔اس نے کہا
وَ بَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ ۚ	آپ حضرات کھاتے نہیں ؟ پھر وہ اپنے دل
(الذاریات: ۲۴-۲۸)	میں ان سے ڈرا ۔انھوں نے کہا ڈریئے نہیں
	اور اسے ایک ذی علم لڑکے کی پیدائش کا
	مژدہ سنایا ۔

سورۂ ذاریات کے علاوہ یہ واقعہ سورۂ ہود (آیات: ۶۹-۷۰) اور سورہ حجر (آیات: ۵۱-۵۳) میں بھی مذکور ہے ۔ فرشتے حضرت ابراہیمؑ کی خدمت میں انسانوں کے بھیس میں گئے تھے ۔حضرت ابراہیمؑ نے انھیں اجنبی اور مسافر سمجھ کر ان کی خوب خاطر و مدارات کی ۔ اسی لئے قرآن نے ان کے لئے 'ضیف ابراہیم (ابراہیم کے مہمان)' کے الفاظ استعمال کئے ہیں ۔نیز ان کی صفت 'مکرمین' (معزز) بیان کی ہے ۔ لفظ 'مکرمین' سے اشارہ اس آؤ بھگت، خیر مقدم، تواضع اور ضیافت کی طرف ہے جس کا اہتمام حضرت ابراہیمؑ نے ان مہمانوں کے لئے فرمایا تھا۔[۴۸] ان آیات سے جہاں ایک طرف یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنے مہمانوں — خواہ وہ ان کے لئے اجنبی ہوں — کی کس قدر تواضع اور ان کے لئے کتنا اہتمام فرماتے تھے وہیں ان سے آدابِ ضیافت کا بھی علم ہوتا ہے ۔مفسرین نے ان آداب کی طرف اشارہ کیا ہے:[۴۹]

۱- مہمان خواہ کوئی بھی ہو اور کیسی بھی حیثیت کا مالک ہو، اس کے ساتھ اعزاز و اکرام کا معاملہ کرنا چاہیئے ۔حضرت ابراہیمؑ بغیر یہ تحقیق کئے کہ یہ نو وارد کون ہیں ؟ کہاں سے آئے ہیں ؟ اور کیوں آئے ہیں ؟ ان کی خاطر و مدارات میں جٹ گئے تھے ۔

۲- سلام کرنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ آنے والا اس میں پہل کرے اور مخاطب اس کا بہترین طریقے پر جواب دے ۔ فرشتے حضرت ابراہیمؑ کی خدمت میں پہنچے تو انھوں نے سلام کیا اور حضرت ابراہیمؑ نے اس کا جواب دیا ۔قرآن میں اس موقع کے جو الفاظ مذکور ہیں ان میں فرشتوں کا سلام

نصب کی حالت میں (سَلَامًا) اور حضرت ابراہیمؑ کا جواب رفع کی حالت میں (سَلَامٌ) ہے۔ علما ے بیان نے لکھا ہے کہ محض اعراب بدل جانے سے حضرت ابراہیمؑ کے جواب میں زیادہ معنویت پیدا ہوگئی ہے اس لئے کہ رفع دوام اور استمرار پر دلالت کرتا ہے۔[۵۰]

۳۔ مہمان کے لئے فوراً کچھ کھانے پینے کا اہتمام کرنا چاہیئے۔ ممکن ہے دورانِ سفر اس نے کچھ کھایا پیا نہ ہو۔ حضرت ابراہیمؑ مہمانوں کا استقبال کرنے کے بعد فوراً ہی ان کے لئے کھانے کے انتظامات میں لگ گئے تھے۔ سورۂ ہود میں صراحت ہے: فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ (پھر کچھ دیر نہ گذری کہ ابراہیم ایک بھنا ہوا بچھڑا ان کی ضیافت کے لئے لے آیا)۔

۴۔ پھر یہ کہ میزبان کو چاہیئے کہ کھانے پینے کے انتظامات مہمان سے چھپا کر کرے۔ یہ بڑی بداخلاقی ہے کہ مہمان سے پوچھا جائے: "آپ کچھ کھائیں گے؟" اسی طرح یہ چیز بھی آدابِ ضیافت کے خلاف ہے کہ یہ انتظامات مہمان کو دکھا کر یا اس کے علم میں لا کر کئے جائیں۔ اس لئے کہ اس صورت میں امکان ہے کہ مہمان تکلف کرتے ہوئے ایسا کرنے سے منع کر دے۔ قرآن کا بیان ہے کہ حضرت ابراہیمؑ مہمانوں کو بٹھا کر چپکے سے گھر کے اندر چلے گئے تھے تاکہ ان کے لئے کچھ کھانے کا انتظام کر سکیں۔

۵۔ یہ چیز مناسب نہیں کہ ہر وقت مہمان کے ساتھ چپکے رہا جائے اور اسے ایک لمحے کے لئے بھی تنہا نہ چھوڑا جائے۔ بلکہ اسے موقع دینا چاہیئے کہ وہ حوائجِ ضروریہ سے فارغ ہو سکے، منہ ہاتھ دھو کر یا غسل کر کے تر و تازہ ہو سکے اور کچھ دیر آرام کر سکے۔ حضرت ابراہیمؑ بھی کچھ لمحے کے لئے مہمانوں کے پاس سے اٹھ گئے تھے۔

۶۔ میزبان کو چاہیئے کہ مہمان کے لئے، اپنی حیثیت کے مطابق اچھے سے اچھا انتظام کرے۔ نووارد حضرت ابراہیمؑ کے لئے اجنبی تھے مگر انھوں نے ان کی ضیافت کے لئے ایک بچھڑا ذبح کر دیا۔ قرآن نے ایک جگہ عِجْلٍ حَنِيْذٍ (ھود: ۶۹) اور دوسری جگہ عِجْلٍ سَمِيْنٍ (ذاریات: ۲۶) کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ عِجْلٍ سَمِيْنٍ سے اشارہ ملتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے ان کی ضیافت کے لئے اچھے سے اچھے جانور کا انتخاب کیا۔ اپنے ریوڑ میں سے دیکھ بھال کر خوب موٹا تازہ بچھڑا چھانٹا۔ حنیذ کے دو معانی آتے ہیں۔ ایک معنی ہے بھنا ہوا۔ دوسرے معنی میں حنیذ اس گوشت کو کہتے ہیں جس سے روغن ٹپک رہا ہو۔[۵۱] دونوں میں سے کوئی بھی معنی اختیار کیا جائے، مقصود یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے

سب سے اچھے جانور کا انتخاب کیا اور اسے ذبح کر کے اور لذیذ کھانا تیار کر کے مہمانوں کے سامنے پیش کیا۔

۷۔ میزبان کے کسی رویے سے یہ اظہار نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ مہمان کی خدمت کر کے اس پر کوئی احسان کر رہا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے مہمانوں کے سامنے کھانا پیش کر کے گذارش کے انداز میں فرمایا: اَلَا تَاْکُلُوْنَ؟ (آپ حضرات کھاتے نہیں؟) انھوں نے کوئی حکمیہ جملہ نہیں کہا۔ یہ استفہامی انداز انھیں کھانے پر ابھارنے کے لئے تھا۔

۸۔ مہمان کے کھانے سے میزبان کو خوشی ہونی چاہیئے۔ یہ بخیلوں کا شیوہ ہے کہ وہ مہمانوں پر خرچ نہیں کرتے۔ اور اگر کبھی ان کے یہاں کوئی مہمان آجائے تو وہ تنگ دلی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مہمانوں کو نہ کھاتا دیکھ کر حضرت ابراہیمؑ ڈر گئے تھے۔ انھوں نے تو اس قدر اہتمام ان کی ضیافتِ طبع ہی کے لئے کیا تھا۔

۹۔ ضیافت کا ایک ادب یہ بھی ہے کہ میزبان مہمان کو اپنے کسی ملازم یا ماتحت کے حوالے کر کے مطمئن نہ ہو جائے بلکہ خود اس کی دیکھ بھال کرے۔

۹۔ حلم و بردباری

سیرتِ ابراہیمی کا ایک نمایاں پہلو حلم و بردباری ہے۔ حلم سے مراد یہ ہے کہ آدمی غیظ و غضب کے موقع پر اپنے نفس کو کنٹرول میں رکھے اور کوئی شخص بدسلوکی کرے تو اس کے جواب میں صبر اور تحمل کا مظاہرہ کرے[۵۲] حضرت ابراہیمؑ میں یہ صفت بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔ قرآن کریم میں دو مواقع پر حضرت ابراہیمؑ کے دیگر اوصاف کے ساتھ اس صفت کا تذکرہ موجود ہے:

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ۝ (التوبۃ: ۱۱۴)	حق یہ ہے کہ ابراہیم بڑا رقیق القلب و خدا ترس اور بردبار آدمی تھا۔
اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ (ھود: ۷۵)	حقیقت میں ابراہیم بڑا حلیم اور نرم دل آدمی تھا اور ہر حال میں ہماری طرف رجوع کرتا تھا۔

ان آیات کے سیاق و سباق میں غور کرنے سے اس وصف کی معنویت مزید آشکارا ہوتی ہے۔ سورۂ توبہ میں اس کا تذکرہ اس موقع سے ہوا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ ایک طویل عرصہ تک اپنے باپ کے لئے دعائے مغفرت کرتے رہے۔ گذشتہ صفحات میں یہ بات آچکی ہے کہ حضرت ابراہیم کی دعوت کے جواب میں ان کے باپ نے سخت برہمی اور درشتی کا مظاہرہ کیا۔ ان کو جھڑکیاں اور دھمکیاں دیں یہاں تک کہ ان کو گھر سے نکال کر دم لیا۔ مگر انھوں نے کسی طرح کا ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ اس کی ڈانٹ ڈپٹ اور سخت سست باتوں کو برداشت کرتے رہے اور انتہائی دل سوزی اور پیار و محبت سے اسے راہ حق کی تلقین کرتے رہے۔ وطن سے ہجرت کرنے کے بعد بھی وہ اس کی ہدایت سے مایوس نہیں ہوئے اور ایک طویل عرصے تک اس کی مغفرت کی دعا کرتے رہے۔ یہ رویہ ان کی صفت حلم پر دلالت کرتا ہے۔

دوسرا موقع وہ تھا جب انھیں 'مہمان' بن کر آنے والے فرشتوں سے معلوم ہوا کہ اپنی نافرمانیوں، سرکشیوں اور بداعمالیوں کے سبب قوم لوط کی ہلاکت کا وقت قریب آگیا ہے۔ ایک ایسی قوم جو مسلسل بداعمالیوں کے سبب ہلاکت کی مستحق ہو چکی ہو، اس کی ہلاکت کی خبر کچھ باعث حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کا جذبۂ حلم انھیں اس خبر پر بے چین کر دیتا ہے۔ وہ بارگاہِ الٰہی میں دستِ بدعا ہو جاتے ہیں کہ: بارالٰہا اس قوم کو کچھ اور مہلت عمل دے دے۔ ہوسکتا ہے وہ اپنا رویہ درست کرلیں۔ بائیبل میں اس موقع پر کچھ تفصیل مذکور ہے کہ کس طرح حضرت ابراہیمؑ نے بار بار اللہ تعالیٰ کی جناب میں درخواست کی کہ اگر ان میں کچھ بھی راست باز بندے ہوں تو ان کی خاطر پوری قوم سے عذاب کو ٹال دے۔[۵۳] قرآن نے اس موقع کی بڑی بلیغ منظر کشی کی ہے:

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ الرَّوْعُ	پھر جب ابراہیم کی گھبراہٹ دور ہوگئی اور
وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا	اسے (اولاد کی) بشارت مل گئی تو اس نے
فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ	قوم لوط کے معاملے میں ہم سے جھگڑا شروع
لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ۝ يٰٓ	کیا۔ حقیقت میں ابراہیم بڑا حلیم اور
اِبْرَاهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا	نرم دل آدمی تھا اور ہر حال میں ہماری

اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ۝ (ھود: ۷۴-۷۶)	طرف رجوع کرتا تھا) آخرکار ہمارے فرشتوں نے اس سے کہا) اے ابراہیم اس سے باز آجاؤ، تمہارے رب کا حکم ہو چکا ہے اور ان لوگوں پر وہ عذاب آکر رہے گا جو کسی کے پھیرے سے نہیں پھر سکتا۔

مولانا مودودیؒ نے ان آیات کی تشریح میں لکھا ہے:

"جھگڑے" کا لفظ اس موقع پر اس انتہائی محبت اور ناز کے تعلق کو ظاہر کرتا ہے جو حضرت ابراہیمؑ اپنے خدا کے ساتھ رکھتے تھے۔ اس لفظ سے یہ تصویر آنکھ کے سامنے پھر جاتی ہے کہ بندے اور خدا کے درمیان بڑی دیر تک ردّ و کدّ جاری رہتی ہے۔ بندہ اصرار کر رہا ہے کہ کسی طرح قوم لوط پر سے عذاب ٹال دیا جائے۔ خدا جواب دے رہا ہے کہ یہ قوم اب خیر سے بالکل خالی ہو چکی ہے اور اس کے جرائم اس حد سے گذر چکے ہیں کہ اس کے ساتھ کوئی رعایت کی جا سکے۔ مگر بندہ پھر بھی یہی کہے جاتا ہے کہ پروردگار اگر کچھ تھوڑی سی بھلائی بھی اس میں باقی ہو تو اسے اور ذرا مہلت دیدے۔ شاید کہ وہ بھلائی پھل لے آئے۔ بائبل میں اس جھگڑے کی کچھ تشریح بھی بیان ہوئی ہے۔ لیکن قرآن کا مجمل بیان اپنے اندر اس سے زیادہ معنوی وسعت رکھتا ہے۔[۵۴]

حضرت ابراہیمؑ کے حلم اور بردباری کی مظہر ان کی وہ دعا بھی ہے جو انھوں نے اپنی ذریت کے بارے میں، اللہ تعالیٰ سے کی تھی۔ اس میں یہ بھی ہے:

فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (ابراھیم: ۳۶)	جو میرے طریقے پر چلے وہ میرا ہے اور جو میرے خلاف طریقہ اختیار کرے تو یقیناً تو درگذر کرنے والا مہربان ہے۔

یہ دعا ان کی کمال درجہ نرم دلی پر دلالت کرتی ہے۔ یہ کہنے میں کوئی حرج نہ تھا کہ جو میری

نافرمانی کرے گا وہ آخرت میں اپنے برے انجام کو پہنچے گا" لیکن ان کی زبان پر یہ جملہ نہ آسکا بلکہ اس موقع پر بھی انھوں نے یہی عرض کیا کہ اے اللہ تیری رحمت سے کچھ بعید نہیں۔ تو چاہے تو ایسے شامت کے ماروں سے بھی درگذر کرسکتا ہے۔ مولانا مودودیؒ نے لکھا ہے:

"یہ حضرت ابراہیمؑ کی کمال درجہ نرم دلی اور نوع انسانی کے حال پر ان کی انتہائی شفقت ہے کہ وہ کسی حال میں بھی انسان کو خدا کے عذاب میں گرفتار ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔ بلکہ آخر وقت تک عفو و درگذر کی التجا کرتے رہتے ہیں۔ رزق کے معاملے میں تو انھوں نے یہاں تک کہہ دینے میں دریغ نہ فرمایا کہ: وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (البقرہ: ۱۲۶) اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور آخرت کو مانیں انھیں ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے) لیکن جہاں آخرت کی پکڑ کا سوال آیا۔ وہاں ان کی زبان سے یہ نہ نکلا کہ جو میرے طریقے کے خلاف چلے اسے سزا دے ڈالیو۔ بلکہ کہا تو یہ کہا کہ ان کے معاملہ میں کیا عرض کروں۔ تو غفور و رحیم ہے"[۵۵]

۱۰۔ صداقت شعاری

قرآن میں حضرت ابراہیمؑ کی ایک صفت صداقت شعاری اور راست بازی بیان کی گئی ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ	اور اس کتاب میں ابراہیمؑ کا قصہ
اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝	بیان کرو بے شک وہ ایک راست
(مریم: ۴۱)	باز انسان اور ایک نبی تھا۔

"صدّیق" کے مفسرین نے تین مفہوم بتائے ہیں۔ اس کا ایک مفہوم حق کی تصدیق کرنے والا[۵۶] اور دوسرا مفہوم آزمائشوں میں پورا اترنے والا ہے[۵۷] اسی مؤخر الذکر مفہوم میں سورۂ صافات میں قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا آیت: ۱۰۵ (تو نے خواب سچ کر دکھایا) کے الفاظ آئے ہیں۔ اس کا تیسرا مفہوم جسے اکثر مفسرین نے اختیار کیا ہے[۵۸] صداقت شعار اور راست باز کے ہیں۔ صدّیق مبالغہ

کا صیغہ ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ شخص جو ہمیشہ سچ بولتا ہو، کبھی اس کے منہ سے کوئی جھوٹی بات نہ سنی گئی ہو۔ حضرت ابراہیم کے لئے آنے والی اس صفت میں بڑی معنویت پائی جاتی ہے۔ ان کی حیاتِ طیبہ کے بعض واقعات میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے خلافِ واقعہ بات کہہ کر جھوٹ بولا۔ قرآن کا مذکورہ بیان اس کی قطعی تردید کے لئے کافی ہے۔

بعض احادیث میں حضرت ابراہیمؑ کی ان باتوں کو "جھوٹ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً روایت ہے:

لم یکذب ابرھیم الا ثلاثا[۵۹] — حضرت ابراہیم کبھی جھوٹ نہیں بولے سوائے تین موقعوں کے

اس مضمون کی احادیث صحیح بخاری کے علاوہ صحیح مسلم، جامع ترمذی، مسند احمد، صحیح ابن خزیمہ مستدرک حاکم، معجم طبرانی، مصنف ابن ابی شیبہ، مسند ابوعوانہ اور حدیث کی دیگر کتابوں میں مروی ہیں ان کے سلسلہ میں علما نے دو موقف اختیار کئے ہیں۔

۱۔ بعض علما نے لکھا ہے کہ عربی زبان میں کذب ہر اس فعل کو کہتے ہیں جو دیکھنے میں خلافِ واقعہ معلوم ہو۔ اس کا اطلاق جس طرح جھوٹ پر ہوتا ہے۔ اسی طرح توریہ پر بھی ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی وہ باتیں توریہ کے قبیل سے ہیں۔ اور توریہ اختیار کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ متقدمین میں حافظ ابن حجرؒ اور متاخرین میں مولانا امین احسن اصلاحی نے یہ تاویل اختیار کی ہے۔[۶۰]

۲۔ بعض دیگر علما نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ روایات اگرچہ سنداً صحیح ہیں لیکن درایت کے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ راویوں کو جھوٹا قرار دینا جس قدر مشکل ہے اس سے بدرجہا مشکل یہ باور کرنا ہے کہ ایک نبی نے جھوٹ بولا ہوگا۔ ضرور کہیں کوئی غلطی ہوئی ہے جس کی وجہ سے ایک بات غلط صورت میں نقل ہوگئی ہے۔ متقدمین میں امام رازیؒ نے اور متاخرین میں مولانا مودودیؒ نے یہ توجیہ کی ہے۔[۶۱]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیاتِ طیبہ کے یہ چند اہم اوصاف اور نمایاں خصوصیات ہیں جن کا مطالعہ گذشتہ صفحات میں پیش کیا گیا۔ انہی خصوصیات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنا خلیل بنایا۔ ان پر اپنے انعام واکرام کی بارش کی، اور انھیں متعدد امتیازات سے نوازا۔

حضرت ابراہیمؑ کی زندگی ہمارے لئے قابلِ تقلید نمونہ ہے جسے اختیار کرکے ہم بھی خوشنودیٔ رب سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔

حواشی ومراجع

۱ مزید دیکھئے: الزخرف: ۲۶-۲۷ ۲ ابوجعفر محمد بن جریر الطبری، جامع البیان عن تاویل القرآن (تفسیر طبری) المطبعۃ الکبریٰ، مصر، ۱۳۲۸ھ، ۱۴/۱۷۔ فخر الدین محمد الرازی، مفاتیح الغیب (تفسیر کبیر) المطبعۃ العامرہ مصر، ۱۳۰۸ھ، ۱۲۶/۶۔ ۳ تفسیر طبری، حوالہ سابق۔ عماد الدین اسماعیل ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، المکتبۃ التجاریہ الکبریٰ، مصر، ۱۳۵۷ھ، ۱۸۱/۳

۴ ابوالقاسم جاراللہ محمود بن عمر الزمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل، مصطفیٰ البابی الحلبی واولادہ، مصر، ۵۷۵/۲۔ علاؤ الدین علی بن محمد بن ابراہیم البغدادی المعروف بالخازن، لباب التاویل فی معانی التنزیل (تفسیر خازن) مطبعۃ التقدم العلمیہ، مصر، ۲۴۱/۴، ابومحمد الحسین الفراء البغوی، معالم التنزیل (تفسیر بغوی) برحاشیہ تفسیر خازن، حوالہ سابق۔ شہاب الدین الآلوسی، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ، مصر، جزء ۱۷، ص ۵۸

۵ دیکھئے تفسیر کبیر حوالہ سابق ۶ کشاف، حوالہ سابق ۳/۳۴۴ نیز دیکھئے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (تفہیم القرآن)، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۷۳ء طبع چہارم۔ ۲۹۲/۴

۷ تفسیر کبیر، ۱۴۴/۷ ۸ تفسیر طبری، ۴۴/۲۳، تفسیر ابن کثیر، ۱۲/۴۔

۹ تفسیر کبیر، ۵۱۸/۱، تفسیر طبری (جدید ایڈیشن) دار المعارف مصر ۱۹۶۹ء، ۱۰۴/۳۔ ابوالفضل جمال الدین محمد بن مکرم بن منظور الافریقی المصری لسان العرب، دار صادر، بیروت ۱۹۵۵ء، ۵۷/۹، مادہ 'حنف'

۱۰ تفسیر ابن کثیر، ۵۵۹/۱، نیز دیکھئے: ابوالقاسم الحسین بن محمد الفضل، الراغب الاصفہانی المفردات فی غریب القرآن، المطبعۃ المیمنیہ، مصر، ۱۳۲۴ھ، ص ۱۳۳

۱۱ تفسیر طبری (جدید) ۵۱۰/۲-۵۱۱، الکشاف، ۳۱۱/۱، تفسیر کبیر، ۱۵۳/۷

۱۲ ابومحمد عبدالملک بن ہشام، سیرۃ النبی، المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ، مصر ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷ء، ۲۴۹/۱

۱۳ مفردات اصفہانی، ص ۲۴۰، مادہ 'سلم' ۱۴ کتاب پیدائش، باب ۱۲، ۱-۴

۱۵ کتاب پیدائش باب ۲۲، ۱۶-۱۸ ۱۶ برناباس کی انجیل، اردو ترجمہ: آسی ضیائی، مرکزی مکتبہ

اسلامی دہلی ۱۹۸۲ء طبع اول، ص ۸۲-۸۳ ۱۷؎ تفسیر ابن کثیر، ۲/۵۹۱، تفسیر کبیر، ۵/۳۷۲۔

۱۸؎ مفردات اصفہانی، ص ۴۲۴، مادہ 'قنت' ۱۹؎ تفسیر ابن کثیر، ۲/۵۹۱

۲۰؎ الامام عبدالحمید الفراہی، التکمیل فی اصول التاویل، دائرہ حمیدیہ، سرائے میر اعظم گڑھ، ۱۳۸۸ھ ص ۵۹ نیز دیکھیے احمد حسن فرحات مقالہ: 'لفظ امّة کی تحقیق'، ترجمہ: محمد رضی الاسلام ندوی، ششماہی علوم القرآن، علی گڑھ جولائی۔ دسمبر ۱۹۸۷ء ۲۱؎ تفسیر ابن کثیر، ۱/۵۵۹۔ مزید دیکھیے تفسیر کبیر، ۱/۴۹۲۔

۲۲؎ تفسیر کبیر، ۱/۵۰۲۔ مولانا امین احسن اصلاحی۔ تدبر قرآن، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، ۱۹۷۶ء، طبع سوم۔ ۱/۲۹۳، ۲۳؎ مفردات اصفہانی، ص ۵۲۸ ۲۴؎ تفسیر کبیر، ۵/۳۷۲۔

۲۵؎ تدبر قرآن ۱/۲۹۳ ۲۶؎ مثلاً دیکھیے: البقرۃ: ۱۸۶، مومن: ۶۰

۲۷؎ تفسیر طبری (جدید) ۱۴/۵۳۱-۵۳۲ ۲۸؎ تفسیر طبری ۱۴/۵۲۳ ۲۹؎ تفسیر طبری، ۱۴/۵۳۲

۳۰؎ تفسیر ابن کثیر، ۳/۲۳۸ ۳۱؎ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْکَنْتُ۔۔۔ والی دعا حضرت اسماعیلؑ کو بے آب وگیاہ وادی میں آباد کرتے وقت کی تھی۔ اُس وقت مکہ آباد نہیں ہوا تھا۔ اس صورت میں یہ توجیہ کی جاسکتی ہے کہ دعا کا یہ جز، مکہ آباد ہونے سے پہلے کا ہے اور بقیہ جز اس کے آباد ہوجانے کے بعد کا ہے۔ یا یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ دعا کا اتنا حصہ حضرت اسماعیل کو وادی میں آباد کرتے وقت کا ہو اور بعد میں مکمل دعا مکہ آباد ہوجانے کے بعد مانگی ہو۔ دیکھیے تفسیر ابن کثیر، ۲/۵۴۱، تفسیر کبیر ۵/۲۵۴ ۳۲؎ تفسیر کبیر، حوالہ سالہ ۶/۱۵۴

۳۳؎ مولانا اصلاحی سے گننے میں تسامح ہوا ہے۔ اس دعا میں 'ربنا' پانچ مرتبہ اور "رب" تین مرتبہ آیا ہے۔ کل آٹھ مرتبہ

۳۴؎ تدبر قرآن ۳/۵۸۰ ۳۵؎ تدبر قرآن ۱/۲۹۴ ۳۶؎ تفسیر ابن کثیر ۲/۵۴۰۔

۳۷؎ کتاب پیدائش باب ۱۷، ۱-۲ ۳۸؎ ایضاً باب ۱۷، ۱۵-۱۷ ۳۹؎ تدبر قرآن ۴/۱۱۴

۴۰؎ تفسیر کبیر، ۵/۵۶۴ ۴۱؎ مفردات اصفہانی، ص ۱۸۹، مادہ 'رجم' ۴۲؎ تفسیر طبری ۱۶/۶۱۔

۴۳؎ تدبر قرآن ۴/۱۱۶ ۴۴؎ تفسیر طبری ۱۴/۵۲۳۔ تفسیر کبیر، ۴/۵۲۷، تدبر قرآن ۳/۲۴۴

۴۵؎ ابوالفدا، اسماعیل بن کثیر الدمشقی، البدایۃ والنہایۃ، دار الریان للتراث مصر ۱۹۸۸ء طبع اول ۱/۱۶۳

۴۶؎ ابواسحاق احمد بن ابراہیم النیساپوری المعروف بالثعلبی، قصص الانبیاء، دار احیاء الکتب العربیۃ سنہ ندارد ص ۸۷ ۴۷؎ ایضاً ص: ۱۰۴

۴۸ تفسیر کبیر، ۷/۱۴۱ ۶، کشاف، ۴/۱۸، تدبر قرآن، ۶/۶-۶۰۶۔

۴۹ دیکھئے تفسیر کبیر ۷/۴۳ ۶۔۴۴ ۶، تفسیر ابن کثیر ۴/۲۳۵، کشاف ۴/۱۸

۵۰ تفسیر ابن کثیر ۲/۱۵۴، ۴/۲۳۵، تفسیر کبیر ۷/۶۴۲، مفردات اصفہانی ص: ۲۳۹۔

۵۱ کشاف ۲/۲۸۰، تفسیر کبیر ۵/۷۵، لسان العرب ۳/۸۴۴، مفردات اصفہانی ص ۱۳۳

۵۲ مفردات اصفہانی ص ۱۲۸، کشاف ۲/۲۸۲ ۵۳ دیکھئے کتاب پیدائش باب ۱۸، ۲۳-۳۲

۵۴ تفہیم القرآن ۲/۳۵۵ ۵۵ تفہیم القرآن ۲/۳۸۹

۵۶ تفسیر کبیر ۵/۵۶۰ ۵۷ تدبر قرآن ۴/۱۱۴

۵۸ دیکھئے تفسیر طبری ۱۲/۵۹، کشاف ۲/۵۱۰، تفسیر کبیر ۵/۵۶۰

۵۹ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، باب قول اللہ عزوجل وَاتَّخَذَ اللّٰہُ اِبْرَاھِیْمَ خَلِیْلًاہ

۶۰ الحافظ احمد بن علی بن حجر العسقلانی، فتح الباری بشرح صحیح البخاری دار المعرفہ، بیروت سنہ ندارد ۶/۳۹۱-۳۹۲، تدبر قرآن ۴/۳۰۰-۳۰۱

۶۱ تفسیر کبیر، ۶/۱۲۹ تفہیم القرآن، ۳/۱۶۷-۱۶۸، رسائل ومسائل، مولانا مودودی، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، طبع ششم، ۱۹۸۷، ۲/۳۲-۳۶۔

ایجنسی کی صورتیں

ششماہی علوم القرآن ایک علمی ودینی رسالہ ہے
اس کی توسیع اشاعت میں حصہ لینا کار خیر ہے

۱۔ ششماہی علوم القرآن کی کم از کم پانچ کاپیاں لینے پر ایجنسی دی جاتی ہے۔

۲۔ پانچ سے بیس کاپی تک ۲۵ فیصد، ۲۰ سے ۳۰ کاپیوں تک ۳۰ فیصد اور ۳۰ سے زائد کاپیاں خریدنے پر ۳۳ فیصد کمیشن دیا جاتا ہے۔

۳۔ مطلوبہ کاپیاں بذریعہ وی۔پی روانہ کی جاتی ہیں اور پیکنگ وڈاک اخراجات ادارہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

۴۔ مطلوبہ کاپیوں کی تعداد میں اضافہ کے لیے ادارہ کو پیشگی اطلاع دینا ضروری ہے